دین کیا ہے

مولانا وحید الدین خاں

دین کیا ہے

از

مولانا وحید الدین خاں

Deen Kiya Hai
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1978
Reprinted 2001

AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110 013
Tel. 435 5454, 435 6666
Fax 435 7333, 435 7980
E-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

دین کیا ہے :

دینی روح کیوں نہیں :

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے :

دین کیا ہے

دین کے معنی ہیں ذلیل ہونا، فرماں برداری کرنا۔ قومٌ دینٌ: فرماں بردار لوگ۔ حدیث میں ہے۔ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے) دین اسلام سے مراد زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکائے ہوئے ہو۔ وہ خدا کا ایسا تابعدار بن جائے کہ اس کے جذبات و احساسات تک خدا کے آگے بچھ جائیں۔ نفسیاتی سطح پر دین جس چیز کا نام ہے، مندرجہ ذیل آیت اس کی مکمل تفسیر پیش کر رہی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

عنکبوت ۶۴-۶۶

دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر وہ اس کو جانیں۔ پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرکے اس کو پکارنے لگتے ہیں اور جب وہ ان کو بچا کر خشکی پر لاتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر کفر کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ عنقریب وہ جان لیں گے۔

جب آدمی کی کشتی سمندر میں ہوتی ہے اور موجوں کے درمیان گھر جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود مکمل طور پر خدا کے اوپر منحصر ہے۔ اپنی بے بسی کے سوا اس وقت اس کو کچھ یاد نہیں رہتا، وہ دل و جان سے خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ سمندر کی لہروں سے بچ کر نکل آتا ہے اور خشکی پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا حال بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ اب وہ دنیوی چیزوں میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عاجزانہ حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ اور کبر و انانیت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ خدا اور آخرت کے بجائے دنیا اور دنیا کے مشاغل اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن جاتے ہیں ــــــ پہلی حالت دین داری کی حقیقت کو بتا رہی ہے اور دوسری حالت بے دینی کی حقیقت کو۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی کا نفسیاتی وجود پوری طرح خدا کے آگے جھک گیا ہو۔ وہ خدا کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا ہو۔ اس کے مقابلہ میں بے دینی یہ ہے کہ آدمی کے اندر ڈھٹائی ہو۔ آج کی دنیا میں گم ہو کر وہ کل کی دنیا کو بھول جائے۔

دین کی اس حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لئے یہاں قرآن کے چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

(یوسف نے کہا) میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہے۔ ہمارے لئے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے قیدخانہ کے ساتھیو،

بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست ۔ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو بس نام ہیں کہ تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں ۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں آتاری ۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے ۔ اس نے فرما دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو ۔ یہی درست دین ہے ۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ (یوسف)

اور اہل کتاب واضح بیان آنے کے بعد متفرق ہو گئے ۔ حالاں کہ ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے ، بالکل یک سو ہو کر ۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں ۔ اور یہی ہے درست دین ۔ (بینہ ۵ ـ ۴)

تم سیدھا رکھو اپنا منھ دین کی طرف یک سو ہو کر ۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو ۔ یہی ہے درست دین ۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو ۔ اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے ۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے (روم ۳۲ ـ ۳۰)

ان آیات کے مطابق دین نام ہے اللہ کو دل سے ماننے کا ، ہر قسم کے شرک سے بچنے کا ، آخرت کو اپنی منزل مقصود بنانے کا ، اللہ کا شکر گزار بن جانے کا ، اللہ کو سارے اختیارات کا مالک جاننے کا ، صرف اسی کی عبادت کرنے کا ، نماز روزہ کی ادائگی کا ، خدا کی طرف یکسو ہونے کا ، فرقہ بندیوں سے بچنے کا ، اپنے خود ساختہ دین پر مگن رہنے کے بجائے اللہ اور رسول کے دین کو پکڑنے کا ۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنے ، وہی سچی دینی زندگی ہے اور مختلف معاملات میں ان کیفیات و اعمال سے مطابقت رکھنے والا جو رویہ ابھرے وہی دینی رویہ ہے ۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر خدا کا ہو جائے ۔ اس کے سوا کوئی اور چیز اس کی عقیدت اور اعتماد کا مرکز نہ رہے ۔

ارکان خمسہ

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام کے ارکان پانچ ہیں : کلمہ توحید ، نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج ۔

دین میں داخلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے ، وہ کلمہ کا اقرار ہے : لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه ۔ اس کلمہ میں دو باتیں ہیں ۔ اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ۔ یعنی خدائی کی تمام اوصاف کے ساتھ اللہ ہی کو خدا ماننا ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا وہ مستند نمائندہ ماننا جس سے حقیقت کی معرفت اور خدا کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ یہ کلمہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کا صرف لسانی تلفظ کر لینا کافی ہو ۔ یہ ایک سنجیدہ فیصلہ کا اعلان ہے ۔ یہ ایک طرف اپنے آقا (خدا) اور دوسری طرف اپنے رہنما (رسول) کو پالینے کا اظہار ہے ۔ یہ پوری زندگی کا عہد نامہ ہے جو بندہ اپنے خدا کو گواہ بنا کر کرتا ہے ۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی ہے جو داخل القلب ایمان (حجرات) ہو ۔ محض زبان سے ان الفاظ کو بول دینا خدا کے یہاں معتبر نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بہت سی ایسی چیزوں کو

"ایمان" میں شمار کیا گیا ہے جن کا تعلق بظاہر عمل سے ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو"۔ کلمہ کا اقرار اگر ایک سنجیدہ فیصلہ کے طور پر ظہور میں آئے تو وہ آدمی کی پوری زندگی میں روح بن کر شامل ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اس کی حیثیت ایک ایسے لفظی ضمیمہ کی ہوگی جس کا آدمی کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس اقرار کے بعد سب سے پہلا فریضہ نماز ہے۔ نماز اسلام کی سب سے اہم عبادت ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ ہر نماز سے پہلے ہاتھ منھ اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں جس کو وضو کہتے ہیں۔ نماز میں مختلف آداب اور کلمات اور دعاؤں کو ادا کرتے ہوئے بندہ اپنے مالک کے آگے جھکتا ہے۔ حتٰی کہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو جوڑتا ہے۔ قیام اور رکوع اور سجدہ گویا خدائی کے سامنے اپنی بندگی کا عملی اعتراف ہے۔ اس طرح بندہ اپنے آپ کو اس مقام عبدیت پر لے جاتا ہے جہاں اس کا خدا اس سے ملاقات کر سکے۔ بندہ اپنے رب کو عجز کی سطح پر پاتا ہے نہ کہ کبر اور انانیت کی سطح پر۔

روزہ سال میں ایک مہینہ کے لئے ماہ رمضان میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا وقت ابتدائے سحر سے شروع ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے۔ اس دوران میں کھانا پینا مطلق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ کے اندر تقویٰ اور شکر (بقرہ) کی کیفیت پیدا ہو۔ کھانا اور پانی آدمی کی سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ جب پیاس سے آدمی کا حلق سوکھ جاتا ہے۔ جب بھوک سے آدمی کا سینہ کھرچنے لگتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا کمزور ہے اور خدا کی مدد کا کتنا زیادہ محتاج ہے۔ یہ تجربہ اس کو اللہ کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلاتا ہے جو کہ تقویٰ کا حاصل ہے۔ پھر شام کو جب وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو وہ اس بات کا تجربہ کرتا ہے کہ اس کے خدا نے کتنی مکمل صورت میں اس کی ضرورتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کا دل احسان مندی کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کی زبان پر حمد اور شکر کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

زکوٰۃ مال اور پیداوار میں خدا کا حق ہے۔ ہم دنیا میں جو کچھ کماتے ہیں خواہ وہ مویشی اور زمین کے ذریعہ ہو یا کارخانہ اور دکان کے ذریعہ یا ملازمت اور مزدوری کے ذریعہ، اس میں "ہمارا" حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ہمارے اندرونی نظام سے لے کر کائنات تک بے شمار اسباب جب ہماری موافقت میں اکٹھا ہوتے ہیں تب ہم کوئی کمائی کر پاتے ہیں۔ یہ اسباب براہ راست مالک ارض و سما کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سال کے آخر میں جب ہم اپنی کمائیوں کا حساب کریں تو اس کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نکال کر اس واقعہ کا اعتراف کریں کہ یہ سب کچھ ہم کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد پر نہ ہوتا تو ہم کسی قسم کی کوئی کمائی نہیں کر سکتے تھے۔ زکوٰۃ یا انفاق دراصل تعلق کی اس اعلیٰ کیفیت کا مظہر ہے جب کہ بندہ بے قرار ہو کر چاہنے لگتا ہے کہ اپنے آقا کے سامنے اپنے آپ کو خالی کر دے۔

اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان جب کسی کو دے رہے ہوتے ہیں تو ان کی زبان حال پکار رہی ہوتی ہے: ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکرانہ نہیں چاہتے۔ یہ تو ہم صرف اللہ کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ (انسان ۹)

حج ایک سالانہ عبادت ہے جو کسی شخص پر زندگی میں ایک بار کے لئے فرض ہے۔ یہ فرض بھی اس وقت ہے جب کہ وہ اپنے مقام سے سفر کرکے حجاز جانے اور وہاں سے واپس آنے پر قادر ہو۔ اور اس کے مواقع رکھتا ہو۔ بصورت دیگر اس پر حج فرض نہ ہوگا۔ حج کے مقامات وہ مقامات ہیں جہاں اسلام کی تاریخ بنی ہے۔ وہاں وہ جگہیں ہیں جہاں پیغمبروں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ جہاں ان کی قربانیوں کی یادگاریں ہیں، جہاں سے شرک کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ واحد مقام ہے جہاں تاریخ انسانی میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ لادینیت کو مغلوب کرکے دین کو قیامت تک کے لئے غالب کر دیا گیا۔ ان آثار سے بھرے ہوئے جغرافیہ کو اس بات کے لئے منتخب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے اہل اسلام ہر سال یہاں جمع ہوں اور سب مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ اسلامی اتحاد کا سبق لیں۔ وہاں کی فضاؤں سے نیا ایمانی عزم اور نیا دینی شوق لے کر اپنے وطن کو لوٹیں۔ حج بتاتا ہے کہ کس طرح سارے انسانوں کو اللہ کے گرد جمع ہو جانا چاہئے۔

روزمرّہ کی زندگی میں

مذکورہ پانچ ارکان قرآن کے الفاظ میں دین کے معلوم اور موقوت ارکان ہیں۔ مگر جب ایک شخص کی زندگی میں دین شامل ہوتا ہے تو وہ صرف متعین اوقات کے اعمال تک محدود نہیں رہتا وہ اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے ہر رویہ سے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ قرآن وحدیث سے اس سلسلے میں جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلی چیز ذکر ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو (آل عمران ۱۹۱) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تمھاری زبان کو ہر وقت ذکر الٰہی میں تر رہنا چاہئے (لایزال لسانك رطبامن ذكرالله)۔

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہونا چاہئے کہ آدمی کو ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ یہ ذکر وہ روحانی تار ہے جس کے ذریعہ سے کوئی بندہ اپنے رب سے دائمی ربط (CONSTANT TOUCH) میں رہتا ہے۔ کبھی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اللہ کی قدرت وکبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اللہ کے احسانات کو یاد کرکے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ کبھی قیامت کی بازپرس کا خوف اس کو تڑپاتا ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرنے لگتا ہے۔ کبھی اپنے عجز کا احساس اس کو ابھارتا ہے کہ وہ اللہ سے رحمت ونصرت کی درخواست کرے۔ غرض اس کے حسّاس قلب میں ہر آن کوئی نہ کوئی ایسی شورش برپا رہتی ہے جو اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے اپنے رب کو پکارتا ہے۔ (اعراف ۲۰۵)

اس ذکر کا نہ کوئی نصاب ہے۔ نہ اس کے الفاظ مقرر ہیں اور نہ اس کی کوئی لگی بندھی صورت ہے۔ یہ تو خدا کی اُس آفاقی دنیا میں غوطہ لگانا ہے جہاں تمام تعینات ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کو متعین شکلوں میں محدود کس طرح

کیا جا سکتا ہے ــــــ اللہ کو یاد کرتے ہوئے قرآن میں تدبر کرتے ہوئے۔ کائنات میں غور کرتے ہوئے، اپنا احتساب کرتے ہوئے، موت اور آخرت کو سوچتے ہوئے بار بار مومن کا جی بھر آتا ہے اور کبھی دل میں اور کبھی زبان سے اس کے اثرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ کی یاد گرم گرم آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے۔ یہ ہے ذکر اور یہ ذکر قرآن کے مطابق سب سے بڑی عبادت ہے (عنکبوت ۴۵)

دوسری چیز نُصح (خیر خواہی) ہے۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا نام ہے) مومن ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت، بغض، حسد، کینہ اور انتقام سے اس کا سینہ خالی ہوتا ہے۔ وہ ہوا کی مانند ہوتا ہے جو سب کے درمیان سے ٹکرائے بغیر گزر جاتی ہے۔ وہ سورج کی مانند ہوتا ہے جو کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کے اوپر چمکتا ہے۔ وہ چڑیوں کی مانند ہوتا ہے جن کے دل میں کسی کے خلاف غصہ اور انتقام نہیں ہوتا۔ مومن خدا کا وہ بندہ ہے جو اپنے کو خدا سے ملا لے۔ وہ بندوں کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے لوگوں کا خالق انھیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا شخص، حدیث کے الفاظ ہیں، اخلاق خداوندی کا پیکر بن جاتا ہے جس کو اپنے تمام بندوں سے یکساں پیار ہے نہ کہ شیطانی اخلاقیات کا جس کو صرف "اپنے لوگوں" سے دلچسپی ہوتی ہے۔ بقیہ انسانوں کے لئے اس کے پاس نفرت اور عداوت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تیسری چیز قسط (انصاف) ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ہمیشہ عدل و انصاف پر قائم رہنا۔ قرآن میں مسلمانوں کو انصاف کا حکم دیا گیا ہے (اعراف ۲۹) نیز فرمایا گیا کہ تم لوگ انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو (نساء ۱۳۵) جو چیزیں آدمی کو انصاف کے راستہ سے ہٹاتی ہیں، ان کی نشان دہی کر کے تاکید کی گئی ہے کہ تم لوگ کسی حال میں انصاف سے نہ ہٹو۔ آدمی تعلقات کے پاس و لحاظ میں انصاف سے ہٹ جاتا ہے۔ فرمایا کہ قرابت داری کا معاملہ ہو تب بھی عدل و انصاف پر قائم رہو (انعام ۱۵۲) ذاتی مفادات و خواہشات کبھی آدمی کو انصاف سے ہٹا دیتی ہیں۔ فرمایا کہ خواہش نفس کا تقاضا ہو تب بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو (نساء ۱۳۵)۔ بغض اور نفرت میں آدمی انصاف کے حدود کو بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ کسی سے تمھاری دشمنی ہو جائے تب بھی تم اس کے ساتھ انصاف ہی کرو۔ کیونکہ یہی روش تقویٰ کے مطابق ہے (مائدہ ۸)

انصاف کا سب سے زیادہ آسان اور قطعی معیار، حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایمان ہی نہیں جو اپنے لئے کچھ اور چاہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور (لا یومن احدکم حتیٰ یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ)

اشاعت ــــ دین

دین کسی دین دار کے اندر جو خصوصیات پیدا کرتا ہے، ان میں سے ایک ہے ـــــ دین کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس پہنچانے کی دو صورتیں ہیں۔ قرآن میں ایک کو تذکیر اور دوسرے کو انذار (اعراف ۲) کہا گیا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مسلمانوں سے ہے، دوسرے کا غیر مسلموں سے۔

تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ اس سے مراد مسلمانوں کو نصیحت و موعظت کرنا ہے۔ مسلمان وہ لوگ ہیں جو دین کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ ان کو دینی ذمہ داریوں سے باخبر کرنا، ان کو خود اپنے عہد کو یاد دلانا ہے۔ اسی لئے اس کو تذکیر کا نام دیا گیا ہے۔

تذکیر کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح (نساء ۱۱۴) ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ان تمام آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو اصلاحی مہم کو نتیجۃً فساد کی مہم نہ بنا دے ـــــ غلطی پر گرفت میں نرمی کا انداز (آل عمران ۱۵۹) اختیار کیا جائے نہ کہ سخت سست کہنے کا۔ سورہ نحل آیت ۱۲۵ میں بتایا گیا کہ مدعو سے جو بات کہی جائے حکمت کے ساتھ کہی جائے، یعنی دلائل و براہین کی زبان میں ہو نہ کہ محض تحکمانہ انداز میں۔ وہ موعظت حسنہ ہو، یعنی گفتگو میں شفقت اور دل سوزی کی روح بھری ہوئی ہو۔ وہ جدال احسن کے پیرایہ میں ہو، یعنی بحث میں تفہیم اور احقاق حق کا انداز ہو نہ کہ ایک دوسرے پر الزام لگانے اور نیچا دکھانے کا۔

تذکیر کا کام اگر حکمراں طبقہ پر انجام دینا ہو تو مسئلہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ غلط انداز تذکیر سے اگر حکمرانوں کو مشتعل کر دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا قتل و خون شروع کر دیں گے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی اور قتل کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے کہ ان کو نصیحت کی جائے تو تنہائی میں کی جائے نہ کہ نعروں اور تقریروں کے ذریعہ:

سئل ابن عباس رضی اللہ عنہما عن امر السلطان بالمعروف ونھیہ عن المنکر فقال: ان کنت فاعلاً ولا بد ففیما بینک وبینہ
ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۷۱

عبداللہ بن عباس رض سے پوچھا گیا کہ بادشاہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا کیا حکم ہے۔ جواب دیا اگر تم کو کرنا ہی پڑے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو بس اپنے اور اس کے درمیان۔

اس سلسلے کی دوسری چیز انذار ہے۔ انذار کے معنی ہیں کسی خطرہ سے آگاہ کرنا، چیتاونی دینا۔ اس سے مراد غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ چوں کہ اسلام کی پیغام رسانی میں سارا زور آخرت کے مسئلہ پر ہوتا ہے، اس لئے اس کام کو بتانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا کہ وہ تو صرف

ایک عذاب شدید کی چیتاونی دینے والے ہیں (سبا ۴۶) ۔ ارشاد ہوا ہے :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ (شوریٰ ۷)

اور ہم نے عربی قرآن اتارا تاکہ تو ڈرا دے مکہ والوں کو اور دوسروں کو اور ان کو جمع ہونے کے دن کی خبر دے دے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۔ اس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں ۔

انذار کے کام کے محرک قرآن کے الفاظ میں دو ہوتے ہیں ۔ نصیحت (خیر خواہی) اور امانت (اعراف ۶۸) بندۂ مومن دوسرے بندگان خدا پر دین پہنچانے کا جو کام کرتا ہے وہ تمام تر اس جذبہ کے تحت ہوتا ہے کہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں اور جنت کے راستہ پر چلنے لگیں ۔ اللہ کا دین جو اس کے پاس ہے ، اس کو وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی امانت سمجھتا ہے اور اپنے اوپر خدا کا یہ فرض سمجھتا ہے کہ اس امانت کو وہ اس کے امانت داروں (عام انسانوں) تک پہنچا دے ۔

ہجرت ، جہاد

جب بھی کوئی خدا کا بندہ بے آمیز خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرف سے اس کو ناموافق ردعمل کا سامنا کرنا پڑے ۔ یہ ردعمل ابتداءً الغا رفی الکلام (فصلت ۲۶) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یعنی داعی کے کلام میں عیب نکالنا ۔ حق کی دعوت کے ساتھ خدا کی نصرتیں ہوتی ہیں ۔ وہ جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو اتنی حقیقی اور اتنی مدلل ہوتی ہے کہ سننے والے اس میں کوئی واقعی خامی نکالنے میں اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ اس وقت وہ عیب نکالنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ فکری کش مکش کبھی عملی ٹکراؤ تک پہنچ جاتی ہے ۔ یہ ٹکراؤ اہل ایمان کے لئے جو صورتیں پیدا کرتا ہے انھیں کی آخری اور انتہائی صورتوں کا نام ہجرت اور جہاد ہے ۔ گویا ہجرت اور جہاد دین کے وہ اجزاء ہیں جو مخالفین کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں ۔

ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا ۔ ابتدائی طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے (مدثر ۵) ۔ مگر اپنے آخری مرحلہ میں یہ کبھی گھر بار چھوڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے ۔ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ طاقت ور حیثیت کے مالک ہوتے ہیں ۔ اس لئے جب وہ مخالفت پر اترتے ہیں تو تمام دوسرے طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر یہ چیلنج دے دیتے ہیں کہ تم یا تو اپنے دین کو چھوڑ دو یا ہماری زمین سے نکل جاؤ (ابراہیم ۱۳) اس وقت اللہ کے بندے اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں ۔

جہاد کے معنے ہیں کوشش کرنا ۔ حق کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے ، وہ بھی جہاد ہے (فرقان ۵۲) ۔ تاہم مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی کبھی بڑھ کر اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ حق کے داعیوں کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں ، وہ ان کو بالکل مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں ۔ اس وقت اہل حق کو اپنے بچاؤ کے لئے اٹھنا

پڑتا ہے۔ اس طرح جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کو جہاد کہتے ہیں۔

جہاد بمعنی قتال، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا اولاً دوسروں کی طرف سے کی گئی ہو (توبہ ۱۳)۔ اہل ایمان کے لئے ہر حال میں پرامن تبلیغ کا حکم ہے۔ جنگ کی اجازت ان کے لئے صرف اس صورت میں ہے جب کہ ان کو جنگ کے لئے مجبور (حج ۳۹) کر دیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اور بھی شرطیں ہیں ـــــ مسلمانوں کی قوت مجتمع ہو، ان کا ایک امیر ہو۔ جس کی تمام لوگ اطاعت کرتے ہوں، وہ منکرین کی بستی سے الگ ہو کر اپنا ایک اجتماعی مرکز بنا چکے ہوں۔ وہ صبر کی صفت اس حد تک اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں کہ قلیل تعداد ہوتے ہوئے مخالفین کی کثیر تعداد سے جم کر مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مکی دور میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی اجازت صرف مدینہ میں ملی جب کہ مذکورہ شرائط پوری ہو چکی تھیں۔ عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق ستّر سے زیادہ بار قتال کی ممانعت آتی رہی۔ اس کے بعد سورۂ حج میں اجازت قتال کی پہلی آیت نازل ہوئی۔

غلبۂ اسلام

دین کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے خوف و محبت کا تعلق جوڑے اور آخرت کی کامیابی کے لئے فکرمند ہو۔ مگر دنیا کی زندگی میں مومن کی ایک اور بھی پسندیدہ چیز (صف ۱۳) ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اسلام کا غلبہ۔ یعنی اہلِ حق دوسری قوموں کے مقابلہ میں دبے ہوئے نہ ہوں بلکہ انھیں کو زمین کے اوپر سربلندی حاصل ہو۔

تاہم اہل ایمان کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ براہ راست اسلامی اقتدار قائم کرنے کی مہم چلائیں۔ قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اقتدار کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے (آل عمران ۲۶)۔ انبیاء میں سے کسی نبی نے بھی حکومت قائم کرنے کی مہم نہیں چلائی۔ حضرت داؤد کو حکومت ملی۔ مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے داؤد تم کو یہ اقتدار ہم نے عطا کیا ہے (ص ۲۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی بابت قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک
عمل کریں ان کو وہ زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ اگلے لوگوں
کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان
کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے ڈر کو امن سے بدل دے گا
وہ میری عبادت کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے
اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ تم

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور ۵۵)

لوگ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

گویا مسلمان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھے، بالفاظ دیگر اللہ سے لپٹا رہے۔ زکوٰۃ ادا کرے، یعنی بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مستعد ہو۔ رسول کی اطاعت کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے درمیان سمع وطاعت کے نظام کو انتہائی حد تک مضبوط کرے۔ یہی وہ اعمال ہیں جو رحمت الٰہی (عطیہ اقتدار) کا باعث ہوں گے۔ یہی وہ مومن گروہ ہے جس کو اللہ اقتدار سونپنے کے لئے منتخب کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ اقتدار ارضی کو منصوبۂ الٰہی کے مطابق چلائیں۔ ان کے لئے اقتدار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو بے خوف وخطر خدا کی عبادت کرنے کے مواقع مل گئے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور شے کو اپنا مرکز توجہ نہیں بناتے۔ وہ کبر اور ظلم سے اپنے آپ کو پاک رکھتے ہیں اور اقتدار کے ملے ہوئے مواقع کو تمکین دین کے لئے استعمال کرتے ہیں نہ کہ تمکین خویش کے لئے۔

خلاصہ

ایک تاجر کو آپ دیکھیں تو مختلف اوقات میں وہ مختلف سرگرمیاں کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ کہیں خاموش کہیں بولتا ہوا، کہیں بیٹھا ہوا کہیں سفر کرتا ہوا، کہیں خرچ کرتا ہوا کہیں مقدمہ لڑتا ہوا۔ تاہم اس کی بظاہر مختلف سرگرمیوں کا حاصل صرف ایک ہے: دولتِ دنیا کو پانا۔ اسی طرح ایک مومن مختلف وقتوں میں بظاہر مختلف عبادات واعمال میں مصروف نظر آتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد ایک ہوتا ہے: دولتِ آخرت کو پانا۔

دولتِ آخرت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی پورے معنوں میں موحّد بن جائے اور ہر قسم کے شرک سے بچتا ہوا اپنے رب سے جا ملے:

عن جابرؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من لقی اللّٰہ لا یشرک بہ شیئاً دخل الجنۃ ومن لقیہ یشرک بہ شیئاً دخل النار (مسلم)

جو شخص خدا سے اس طرح ملا کہ وہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک نہیں کر رہا تھا وہ جنت میں داخل ہوا۔ جو اس طرح ملا کہ وہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک کر رہا تھا وہ آگ میں داخل ہوا۔

توحید اور شرک کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو شخص خدا کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرے وہ موحد ہے۔ اور جو شخص کسی بت کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرتا ہو وہ مشرک ہے۔ یہ تو دونوں کی ظاہری علامتوں میں سے صرف ایک علامت ہے۔ توحید اور شرک دراصل طالب اور مطلوب (حج ۷۳) بننے کا معاملہ ہے۔ یہ آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ کسی شخص کا معبود وہی ہے جو اس کا حقیقی مطلوب ومقصود ہو، جس کی طرف وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جھکا ہوا ہو۔ جس چیز کو آدمی عظمت کا مقام دے، جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو، جس کے لئے اس کے احترام وتقدس کے جذبات وقف ہوں، جس کی یاد میں وہ غرق رہتا ہو، جس کے تصور سے اس کے نازک احساسات

بھڑکتے ہوں، جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے سب زیادہ محبت کرتا ہو، جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ شامل (INVOLVE) کر دے کہ وہی اس کا سب کچھ اور وہی اس کی آخری امید بن جائے۔ کسی کو اپنی زندگی میں اس قسم کا برتر مقام دینا ہی اس کو اپنا الٰہ (معبود) بنانا ہے۔ خواہ وہ کوئی دیوتا ہو یا آدمی کا اپنا نفس۔ کوئی جاندار چیز ہو یا بے جان، کوئی زندہ ہستی ہو یا مردہ، اور وہ کئی ہوں یا صرف ایک۔

ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ آدمی صرف خدا کو اپنا الٰہ بنائے۔ وہ شرک کی تمام قسموں سے بچ کر پورے معنوں میں توحید پرست بن جائے۔ ہر قسم کی عظمت و کبریائی کا مالک صرف ایک اللہ ہے۔ جو آدمی اختیار و اقتدار میں کسی اور کو شریک کرے، وہ اسی واحد سہارے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے سوا اس دنیا میں کوئی اور سہارا نہیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آسمان سے گر پڑے (حج ۳۱) اور اس کے بعد ساری کائنات میں اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے سوا کسی کو عقیدت و اعتماد کا مرکز بنانا اس کو خدا کا برابر ٹھہرانا ہے۔ ایسا عمل اس کائنات میں "ظلم عظیم" ہے اور اس کا انجام دائمی عذاب ہے (من مات وھو یدعو للہ ندا دخل النار، بخاری) حتیٰ کہ یہ بھی شرک، سب سے بڑا شرک ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نمائش چاہتا ہو۔ اس کا احترام کیا جائے تو وہ خوش ہو، احترام نہ کیا جائے تو وہ بپھر اٹھے۔ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ وہ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہے جس سے زیادہ بری چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمھارے بارے میں مجھ کو سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ شرک اصغر ہے۔ پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے۔ فرمایا: ریار

اخوفُ ما اخافُ علیکم الشرکُ الاصغر فسئل عنہ فقال الریاء (احمد، طبرانی، بیہقی)

آدمی کی عبادت اور اس کی اسلامی سرگرمیاں اگر یہ نتیجہ پیدا کریں کہ وہ حقیقی معنوں میں اَلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا (اسراء ۲) کا مصداق بن گیا ہو، ذات خداوندی اس کی تمام یادوں اور توجہات کا مرکز بن جائے، خدا کو الٰہ بنانا اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف ایک عقیدہ کی چیز نہ ہو بلکہ وہی اس کا نفسیاتی آسرا ہو جس پر وہ جی رہا ہو —— آدمی کی دینی زندگی اگر یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہو تو بلاشبہ وہ دین پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شدید اندیشہ ہے کہ وہ ابھی تک دین کو نہ پا سکا۔ دین کے نام پر وہ کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔

صریح نصوص سے ثابت ہے کہ عمل کا دار و مدار تمام تر نیت پر ہے۔ اللہ کو صرف وہی عمل مطلوب ہے جو خالصتاً اس کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ جس عمل میں کوئی اور غرض شامل ہو جائے، اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں —— جو لوگ خدا کے دین کو تجارت بنائیں۔ جو دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کے تحت کسی دینی عمل کو اختیار کریں۔ جو کسی دینی عمل کو بطور "کیریر" کے شروع کریں۔ جو ایسی دینی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہوں جن کے ذریعہ عزت و شہرت ملتی ہے، جن سے آدمی کی "امیج" میں اضافہ ہوتا ہے، جن سے عوامی قیادت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ شدید طور پر اس خطرہ میں مبتلا ہیں کہ ان کے اعمال قیامت میں بے وزن قرار دے دیئے جائیں۔ خواہ ان میں یہ دنیوی محرکات شعوری طور پر داخل ہوئے ہوں یا غیر شعوری طور پر۔

دینی روح کیوں نہیں

مومن کون ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مومن وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ جب اس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے۔ جب اس کو قرآن کی آیتیں سنائی جائیں تو اس میں اس کو اضافہ ایمان کی غذا ملنے لگے۔ جس کے لئے خدا ایک ایسی لازوال ہستی بن جائے جس پر وہ کامل بھروسہ کر سکتا ہو (انفال)۔ ایمان، خدا اور بندے کا مقام اتصال ہے۔ اس اتصال کا حقیقی طور پر وقوع میں آنا ہی ان کیفیات کے ظہور میں آنے کی یقینی ضمانت ہے۔ پاور ہاؤس اور بلب کا ملاپ اگر نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا تو خدا اور بندے کا ملاپ کیوں کر نتیجہ سے خالی رہ جائے گا۔

مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو حقیقۃً "اسلام"، کہا گیا ہے۔ ہمارے زمانہ کے عجائب میں یہ عجوبہ سب سے زیادہ حیرت ناک ہے کہ ہر طرف اسلام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں ——— نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر "صلاۃ خشوع" سے مسجدیں خالی ہیں۔ اسلامی مدرسوں کی تعمیرات بلند ہو رہی ہیں مگر وہ لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی زندگیوں میں بھی اسلام کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ اسلام کے نعروں سے فضائیں گونج رہی ہیں مگر اس اسلام کا وجود نہیں جو تنہائیوں میں آدمی کو بے چین کر دے۔ دوسروں کی پیٹھ پر اسلامی کوڑے لگ رہے ہیں مگر اپنی "پیٹھ" کو خدا کے حوالے کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلامی تقریروں کی بہار آرہی ہے مگر خدا کی زمین ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کو خدا کے خوف نے بے زبان کر رکھا ہو۔ "احتساب کائنات"، کے ہنگامے ہر طرف برپا ہیں مگر احتساب نفس کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے جسم سے اس کی روح نکال دی گئی ہے۔ خودساختہ طور پر اسلام کا ایسا ایڈیشن تیار کر لیا گیا ہے جو بظاہر اسلام ہے مگر وہی چیز اس میں موجود نہیں جو خدا و رسول کے نزدیک اسلام کا اصل مقصود تھی۔

اس کو سمجھنے کے لئے یہود کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ کیونکہ جو قومیں کتاب الٰہی کی حامل ہوں، ان کے بگاڑ کے اسباب ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ یہود کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ بعد کے دور میں ان کے اندر قساوت (سخت دلی) آگئی۔ قساوت کی حالت یہ نہیں ہے کہ دین اپنی صورت کے اعتبار سے باقی نہ رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ دین کی صورتیں ہمیشہ مکمل طور پر باقی رہتی ہیں۔ البتہ قوم کے اندر سے ان کی روح نکل جاتی ہے۔ قساوت دراصل ذکر اور خشیت کے خاتمہ کا نام ہے (زمر ۲۲-۲۳) نہ کہ ظواہر دین کے خاتمہ کا۔

قوم کے اندر یہ بگاڑ انکار دین کے نام پر نہیں آتا، بلکہ اقرار دین کے جلو میں آتا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق شیطان ان کو ایسی ایسی تاویلات سجھاتا ہے جس کی روشنی میں ان کو اپنا انحراف عین دین نظر آنے لگے۔ وہ اپنے اعمال

کو خوبصورت الفاظ میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے مزین کر لیتے ہیں (انعام ـ ۴۳) اس تزئین کی سب سے زیادہ معروف صورت وہ ہے جس کو قرآن میں یُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ (مائدہ ـ ۱۳) فرمایا گیا ہے۔ تحریف کے معنی ہیں پھیرنا۔ کلام کو اس کے محل سے پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا وہ مطلب و معنی بیان کیا جائے جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ گویا یہود کی تزئین یہ تھی کہ وہ اپنی قساوت، بالفاظ دیگر اپنی بے روح دین داری، کو لفظی تاویلات سے ایسا خوش نما بنا لیتے تھے کہ وہی اصل دین نظر آنے لگے۔

تحریف کی صورت عام طور پر وہی ہوتی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں غلط تعبیر (MISINTERPRETATION) کہا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ یہود کو یہ خبر دی گئی تھی کہ تم کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی ہے (بقرہ ـ ۴۷) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے تم کو دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے چن لیا ہے۔ تم کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ تم خدائی تعلیمات کے حامل بنو اور اس کو خدا کی طرف سے دوسری اقوام تک پہنچاؤ۔ اپنے اصل مفہوم میں یہ آیت نظریاتی فضیلت کے معنی میں تھی۔ مگر یہود نے اس کو نسلی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ یہود کی نسل میں پیدا ہونا اس بات کے لئے کافی بن گیا کہ آدمی اس فضیلت کا مستحق ہو اور خدا کے انعامات اس کو حاصل ہوں۔ کتاب الٰہی کی اس تحریف (لفظ کو اس کے موقع و محل سے پھیرنے) کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

وَقَالُوا کُونُوا ھُودًا اَوْ نَصٰرٰی تَھْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (بقرہ ـ ۱۳۵)

وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ کہہ دو نہیں۔ بلکہ ہم پیروی کرتے ہیں دین ابراہیم کی اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھا۔

گویا ملت ابراہیمی کا فرد وہ ہے جو شرک سے اپنے کو بچائے اور سچی توحید پر قائم ہو۔ محض نسل ابراہیمی میں ہونے سے کوئی ملت ابراہیمی کا فرد نہیں بن جاتا۔ یہود کو جو "فضیلت" دی گئی وہ اپنے اصل مفہوم میں ایک سنگین ذمہ داری کو یاد دلانے والی چیز تھی۔ مگر موقع و محل سے ہٹانے کے بعد وہ بے خوفی کا محرک بن گئی۔ اللہ کا ایک حکم جو خشیت پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ قساوت پیدا کرنے والا بن گیا —— یہ تھی یہود کی تحریف۔ اپنی اس قسم کی تحریفوں کے ذریعہ انھوں نے دین خداوندی کو ایک بے روح ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم لوگ پچھلی امتوں کے راستہ پر چلو گے —— (لتتبعن سنن من کان قبلکم) چنانچہ مسلمانوں میں آج وہ سارے انحراف دیکھے جا سکتے ہیں جو سابق اہل کتاب میں پائے جاتے تھے۔ جس طرح یہود نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اللہ کے خصوصی بندے ہیں اور وہ ضرور نجات پائیں گے۔ اسی طرح ہم نے یہ عقیدہ قائم کر لیا ہے کہ "مسلمان خیر امت ہیں اور وہ سب کے سب مرحوم و مغفور ہیں"۔ یہ بات بجائے خود صد فی صد درست ہے۔ مگر وہ مسلم امت کے بارے میں ہے نہ کہ کسی مسلم نسل کے بارے میں۔ امت کو نسل کے معنی میں لینا بلاشبہ یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مصداق ہے۔ اپنے نظریاتی مفہوم میں یہ بات ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ مگر جب اس کو نسلی مفہوم میں لے لیا گیا تو وہ صرف قساوت اور بے خوفی کا محرک بن کر رہ گئی۔

حقائق کے بجائے خوش خیالیوں پر دین کی بنیاد

یہود کا نظریاتی فضیلت کو نسلی فضیلت کے معنی میں لینا یہ معنی رکھتا تھا کہ یہود کی نسل محض نسل کی حیثیت سے خدا کے نزدیک برگزیدہ ہے۔ اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر یہ ہوا کہ خدا پرستی اور یہودیت ہم معنی الفاظ بن گئے۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (مائدہ - ۱۸) یہودی اور نصرانی پیدا ہونا ہی ہدایت یاب ہونا ہے ——— (بقرہ - ۱۳۵) ہمارا کوئی آدمی جہنم میں نہ جائے گا اور اگر گیا بھی تو اس کا جانا صرف چند روز کے لئے ہو گا (بقرہ ۸۰)۔ قرآن نے ان کی ان خوش خیالیوں کو امانی (بقرہ ۸۲) کہا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس قسم کے امانی خواہ یہود قائم کریں یا مسلمان قائم کریں، خدا کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا ابدی قانون تو یہ ہے کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے (نساء ۱۲۳)

امانی کے معنی ہیں بے بنیاد توقعات۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور فرار نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ موضوع روایات اور بے سند قصے ہیں جو یہودی علماء و مشائخ نے وضع کئے اور پھر پوری قوم میں رائج ہو گئے (اکاذیب مختلقة سمعوها من علمائهم فتقلبوها على التقليد، تفسیر نسفی) قوم یہود کے انتہائی مبالغہ آمیز فضائل، یہودیت سے تعلق رکھنے والی معمولی معمولی چیزوں کے مقدس اور متبرک ہونے کی طلسماتی داستانیں کثرت سے ان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ پوری کی پوری قوم حقیقی عمل سے غافل تھی اور انھیں موضوع روایات اور بناوٹی قصے کہانیوں پر جی رہی تھی مثلاً ———
تورات کے الفاظ ایک بار بھی جس کے کان میں پڑ گئے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ اسرائیلی بزرگوں کا نام جس نے احترام و محبت سے لے لیا، اس کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں۔ "قیامت کے دن ابراہیمؑ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے "

Talmud (Every man's Liberary Series)
Edited by Dr. Kohen, P. 404

ٹھیک یہی حال آج مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ کتاب اللہ کے بجائے کتاب الامانی ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ فضائل اعمال کی بے اصل روایات اور بزرگوں کے کشف و کرامت کی فرضی داستانیں بے شمار تعداد میں قوم کے اندر پھیلا دی گئی ہیں اور قوم کی قوم انھیں خوش خیالیوں کے سہارے جی رہی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں وضع حدیث کا سلسلہ ابتداءً سیاسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ اپنی سیاست کے حق میں دینی تصدیق حاصل کرنے کے لئے ہر فرقہ نے بے شمار حدیثیں گھڑیں اور ان کو رسول اور اصحاب رسول سے منسوب کر کے عوام میں پھیلا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بیت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئیں، صرف ان کی تعداد تقریباً تین سو ہزار ہے۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں میں "فضائل اعمال" کی حدیثیں وضع کرنے کا رجحان ابھرا۔ اس کا محرک

وہی تھا جس نے اس سے پہلے عیسائیوں میں مقدس جھوٹ (Pious Fraud) کا نظریہ پیدا کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بعد ابتدائی صدیوں میں مسیحیت بڑی ابتر حالت میں تھی۔ اس زمانہ میں مسیحی بزرگوں نے سوچا کہ مسیحیت کی ترقی کی ایک تدبیر یہ ہے کہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے عجائب وغرائب باتیں گھڑی جائیں اور ان کو عوام میں پھیلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے وضع حدیث کا ثبوت خود موجودہ مقدس انجیل میں موجود ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کے نام اپنے خط (رومیوں ۳ : ۷) میں لکھا :

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو"

قرن اول کے بعد جب مسلمانوں میں باہمی لڑائیاں اور سیاسی جھگڑے بہت بڑھ گئے تو کچھ لوگوں نے "فضائل" کے نام پر جھوٹی حدیثیں وضع کرنی شروع کیں تاکہ لوگوں کو دینی اعمال کی طرف راغب کیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضائل جہاد نفس اور انفاق مال جیسی چیزوں کے لئے کارآمد نہ تھے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے طلسماتی فوائد بتائے جانے لگے۔ مثلاً کوئی شخص فلاں سورہ روزانہ پڑھے تو وہ خدا کے مقابلہ میں آدمی کا حصار بن جاتی ہے۔ جہنم کے فرشتے جب اس کو عذاب دینے کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے لڑ کر ان کو بھگا دیتی ہے۔ ایک شخص نے سیکڑوں کی تعداد میں اس مضمون کی "حدیثیں" گھڑ کر پھیلائیں کہ فلاں سورہ فلاں وقت "پڑھو" تو اتنا ثواب ہے اور فلاں وقت پڑھو تو اتنا ثواب ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم نے دین کے معاملہ میں یہ جرأت کیسے کی۔ اس نے جواب دیا :

قصدتُ ان اشغل الناس بالقرآن عن غيره   میں نے چاہا کہ لوگوں کو دوسرے مشاغل سے ہٹا کر قرآن پڑھنے میں لگا دوں۔

کسی نے حدیث گھڑی کہ کسی شخص کے ایک اولاد ہو اور اس کا نام وہ محمد رکھے تو باپ بیٹا دونوں جنت میں جائیں گے (من ولد له مولود فسماه محمدا كان هو والولد في الجنة) کسی نے حدیث بنائی کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کو جنت میں سات ہزار شہر ملیں گے۔ ہر شہر میں سات ہزار محل ہوں گے۔ ہر محل میں سات ہزار حوریں ہوں گی (من قال لا اله الا الله اُعطى في الجنة سبعين الف مدينة في كل مدينة سبعون الف قصر في كل قصر سبعون الف حوراء) کسی نے کہا کہ جس شخص نے ۱۵ شعبان کو ۱۲ رکعتیں پڑھیں، اس طرح کہ ہر رکعت میں ۳۰ بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا تو وہ نہ صرف خود جنت میں جائے گا بلکہ اپنے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کو بھی خدا سے کہہ کر جنت میں لے جائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی (من صلى ليلة النصف من شعبان ثنتى عشرة ركعة يقرأ في كل ركعة ثلاثين مرة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ شفع في عشرة من اهل بيته قد استوجبوا النار)

سخاوی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : القول البديع في الصلاة على الحبيب الشفيع۔ یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے بارے میں ہے۔ پوری کتاب عجائب وغرائب قصوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ،

سے وسيكون في آخر امتي اناس يحدثونكم مالم تسمعوا انتم ولا آباؤكم فاياكم واياهم (رواه مسلم عن ابي هريرة)

ان کے بیان کے مطابق، یہ ہے :

" ایک عورت حسن بصری کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حسن بصری نے کہا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر چار رکعت نفل نماز پڑھ اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ پڑھ اور اس کے بعد لیٹ جا۔ اور سونے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہ۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے لڑکی کو خواب میں دیکھا کہ بے حد سخت عذاب میں ہے۔ تارکول کا لباس جسم پر ہے۔ دونوں ہاتھ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں آگ کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ عورت صبح کو اٹھ کر پھر حسن بصری کے پاس گئی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا، ان کو بتایا۔

اگلے دن حسن بصری نے خواب میں دیکھا کہ جنت کا ایک باغ ہے۔ اس میں ایک بہت اونچا تخت ہے۔ اس میں ایک حسین وجمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر ایک نور کا تاج ہے۔ وہ کہنے لگی حسن! تم نے مجھ کو پہچانا، کہا نہیں۔ بولی، میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں تم سے ملی تھی۔ حسن بصری نے کہا تیری ماں نے تو تیرا حال اس کے برعکس بتایا تھا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا، میری حالت وہی تھی جو ماں نے بیان کی۔ میں نے پوچھا، پھر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوگیا۔ اس نے کہا، ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے جو میری ماں نے آپ سے بیان کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا۔ انھوں نے ایک دفعہ درود پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ ان کا درود اللہ کے یہاں ایسا قبول ہوا کہ اس کی برکت سے ہم سب اس عذاب سے آزاد کر دیئے گئے اور ہم کو وہ رتبہ نصیب ہوا۔ جو تم دیکھ رہے ہو "

اس قسم کی بے شمار روایات گھڑ کر ساری امت میں پھیلا دی گئیں۔ اب اگر کچھ لوگ یہ کریں کہ ان "حدیثوں" کو جمع کر کے فضائل اعمال کا صحیفہ مرتب کریں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو دین دار بنانا شروع کریں تو ایک عجیب وغریب قسم کا دین وجود میں آئے گا۔ لوگ بظاہر ذکر اور درود اور تلاوت اور نماز میں مشغول ہوں گے مگر یہ مشاغل ان کے سینہ میں خوف خدا سے کانپنے والا قلب نہیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایسا قلب وجود میں آئے گا جو اپنے کو خدا کی پکڑ سے بالکل مامون سمجھے گا۔ معمولی معمولی باتوں سے جب ہر صبح و شام جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہوں تو آخرت کے خوف سے کانپنے کی کیا ضرورت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی "امانی" نے اللہ کے دین کو عملاً مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ دین جس کا مقصد بندوں میں خشیت اور اندیشہ کی کیفیت پیدا کرنا تھا۔ وہ صرف قساوت میں اضافہ کا سبب بن گیا۔

خالق کے بجائے مخلوق کا سہارا پکڑنا

قرآن کی ایک آیت ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (مائدہ ۳۵)	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کا وسیلہ تلاش کرو۔

اس آیت میں "وسیلہ" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے اس مفہوم میں لے لیا جس میں وہ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح دنیوی حکمرانوں کے یہاں ذریعے اور وسیلے ہوتے ہیں، اسی طرح خدا کے یہاں بھی وسیلے ہیں۔ یہ وسیلے انبیاء اور اولیاء ہیں۔ ان وسیلوں کو پکڑ لو، ساری خدائی تمھارے ہاتھ میں آ جائے گی۔ یہ عقیدہ چونکہ عوامی مزاج سے قریب تھا، اس کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب یہ حال ہے کہ خدا کے بالمقابل بے شمار زندہ اور مردہ "خدا" پیدا ہو گئے ہیں جن کا دامن لوگوں نے تھام رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ خدائی وسیلے دنیا سے لے کر آخرت تک ان کے سارے کام بناتے چلے جائیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے عقیدہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی زبان میں "وسیلہ" کا یہ مفہوم سرے سے نہیں آتا۔ لفظ وسیلہ مذکورہ آیت میں، اردو (ذریعہ) کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ اپنے عربی مفہوم (قرب) کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی فرماں برداری اور اس کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کی قربت اور نزدیکی حاصل کرو (تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ، قتادہ) ابن جریر طبری نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: اطلبوا القربة الیہ بالعمل بما یرضیہ (اللہ کی نزدیکی اس عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرو جس عمل کو وہ پسند کرتا ہے)

کسی بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے قریب پہنچ سکے۔ اس آیت میں یہ راز کھولا گیا تھا کہ اس مطلوب کو پانا ہر بندہ کے لئے ممکن ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنے رب کے پسندیدہ راستہ پر لگا دے۔ مگر غلط تعبیر نے آدمی کو اس خزانہ سے محروم کر دیا جو اس کے اندر رکھا گیا تھا۔ جس آیت میں خدا کو پانے کا راز بتایا گیا تھا، اس نے لوگوں کو صرف قبروں اور آستانوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا۔ وہ آیت جس میں خوف خدا کی غذا تھی، ایک خود ساختہ تشریح کے ذریعہ اس میں بے خوفی کا سامان تلاش کر لیا گیا۔ جو قرآن اللہ کی پرستش کی تعلیم دینے آیا تھا، اس سے لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کا حکم نکال لیا۔ اس عقیدہ کے تحت جو مذہب بنا، قدرتی طور پر اس میں قبروں کی پرستش اور زندہ "بزرگوں" کی عقیدت نے خوب ترقی کی "اولیاء اللہ" کی فضیلت وکرامت کی بے شمار فرضی کہانیاں گھڑی گئیں۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ حضرات بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں۔ بزرگوں کی کراماتی داستانوں کی مقدس طلسم ہوش ربا تیار ہو گئی ہے اور ساری قوم اس کی تلاوت میں مشغول ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے خوف و محبت، گناہوں سے بچنے کی تڑپ، آخرت کی بازپرس سے بچنے کا فکر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ "وسیلہ" حاصل کر لینے کے بعد ان چیزوں کے لئے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس قسم کے تمام عقائد دراصل خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ (Underestimation) ہیں۔ جو لوگ زندہ یا مردہ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، انھیں خبر نہیں کہ یہ ہستیاں ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں (حج ۷۴) جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے "اکابر" کا دامن تھام کر جنت میں پہنچ جائیں گے، ان کو خدا کے قانون جزا و سزا کی سنگینی کا اندازہ نہیں (انعام ۹۱) جو لوگ آخرت کے دن کو اپنے "بڑوں" کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں، ان کو خبر نہیں کہ آخرت جب آئے گی

تو عالم یہ ہوگا کہ سارا آسمان، خدا کے ایک ہاتھ میں لپٹا ہوا ہوگا۔ اور زمین کو خدا اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا:
انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این الجبارون این المتکبرون این ملوک الارض (میں ہوں بادشاہ میں ہوں جبار، میں ہوں کبریائی والا، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں جبار کہاں ہیں متکبر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے تو راوی کا بیان ہے کہ:

فرجف برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنبر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ
حتی قلنا لیخرن بہ (ابن کثیر)	ہم نے کہا کہ آپ منبر سے گر پڑیں گے

دوسری طرف ہم نے ایسے ایسے "بزرگ" پیدا کر رکھے ہیں جو میدان حشر میں عین خدا کے سامنے ہماری طرف سے وکیل بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کسی کو جنت میں جانے نہ دیں گے جب تک اپنے تمام معتقدین کو جنت میں نہ بھیج لیں۔

معانی کے بجائے صورتوں کو مطلوب سمجھ لینا

۱۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵۴ میں کہا گیا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ اس کا ترجمہ کچھ لوگوں نے ان الفاظ میں کیا: "ہم نے سہل کر دیا قرآن کو حفظ کرنے کے لئے، پھر کوئی ہے حفظ کرنے والا"۔ اس ترجمہ کے مطابق سمجھ لیا گیا کہ اس آیت میں قرآن کو رٹ کر یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اب بے شمار لوگ قرآن کو رٹنے میں مشغول ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس آیت کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کو یاد کرنا بجائے خود مومن کی ایک ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ آیت کا اس قسم کے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ عبد القادر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے: "ہم نے آسان کیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا"۔ مطلب یہ کہ قرآن میں حقائق دینیہ کو مدلل اور قابل فہم انسانی زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر کوئی ہے جو اس پر دھیان دے اور اس سے اپنے لئے نصیحت اور اصلاح کا سامان حاصل کرے۔ اس آیت میں کتاب الٰہی پر غور و فکر کے لئے اکسایا گیا ہے۔ قرآن کے اندر آدمی کے قلب و دماغ کے لئے جو ربانی غذا رکھی گئی ہے، اس میں سے اپنا حصہ لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مگر ایک معنوی حقیقت کو لفظی تکرار کے معنی میں لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیت آدمی کے لئے اس قسم کی غذا کا ماخذ نہ رہی۔ وہ الفاظ کو زبانی طور پر رٹنے کے ایک بے کیف عمل کے ہم معنی بن کر رہ گئی۔

۲۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

مَن قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ	جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا۔

اس قسم کی روایات میں لفظ "قول"، کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس کلمہ اسلام کا تلفظ ہی جنت میں داخلہ کے لئے کافی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کا ایک قول اس کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ مگر قول سے مراد ایک حقیقی انسان کا قول ہے نہ کہ کسی کمپیوٹر کا قول۔ ایک حقیقی انسان کا قول اس کی پوری ہستی سے ٹپکتا ہے نہ کہ محض حرکت لسانی سے وجود میں آتا ہے۔ ایک بندہ جب فی الواقع یہ قول دیتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"، تو وہ محض کچھ رسمی

الفاظ نہیں بولتا ۔ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کو پالیا ہے ۔ یہ بول اس کی اندرونی ہستی کا لفظی اظہار ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقی ہستی سے الگ محض حرکت لسانی کی سطح پر چند کلمات کا تلفظ۔

"قول" کی یہ حقیقت قرآن و حدیث سے بخوبی واضح ہے ۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے کہا تھا کہ " اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے"۔ اس گروہ کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کے اس "قول" کی وجہ سے اللہ نے ان کو جنت دے دی (فاثابھم اللہ بما قالوا جنات ۔ ۸۵)

مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول محض حرکت لسان نہ تھا بلکہ اعلیٰ نفسیاتی سطح پر عرفان حق کا معاملہ تھا۔ یہ ان کی پوری ہستی تھی جو لفظوں کی صورت میں ابل پڑی تھی ۔ اس قسم کا واقعہ اگرچہ بظاہر ایک قولی اقرار ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ کائنات کا سنجیدہ ترین معاملہ ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر عاجز اور حقیر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر وہ قادر مطلق ہستی ہوتی ہے جس کی تجلیات کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ یہ صورت حال اس اقرار کو بے حد سنگین واقعہ بنا دیتی ہے ۔ اپنی ساری لطافت کے باوجود جب یہ "قول"، عالم واقعہ میں ظہور میں آتا ہے تو انسانی شخصیت کے لئے وہ اتنا سنگین ہوتا ہے کہ آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا سیلاب پھٹ پڑتا ہے (تَرٰیٓ اَعۡیُنَهُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ)

وہ اقرار ایمان جو آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے، قرآن و حدیث کے مطابق، آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے ۔ مگر اس سے یہ مفہوم نکال لیا گیا کہ زبان سے کلمہ اسلام کا تلفظ کرو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ ۔

۳ ۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (احزاب)   اے ایمان لانے والو اللہ کو یاد کرو بہت زیادہ

اس آیت میں " ذکر کثیر" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے گنتی کے معنوں میں لے لیا ۔ وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کتنا زیادہ ذکر ہو تو وہ کثیر کہا جائے گا ۔ کچھ لوگوں نے تین سو کا نصاب بنایا ۔ کسی نے پچاس ہزار کا، کسی نے ایک لاکھ کا ۔ اس طرح کے عددی نصاب کا یہ بھی تقاضا تھا کہ ذکر کے لئے کوئی متعین لفظ یا فقرہ ہو ۔ کیوں کہ الفاظ کے تعین کی صورت ہی میں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ نصاب کا عدد پورا ہوا یا نہیں ۔

مگر اس طرح کے کسی عمل کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہاں اللہ کے ذکر سے مراد اللہ کی یاد ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو بہت زیادہ یاد کرو ۔ خدا کا اور خدا کی باتوں کا تصور اپنے اوپر اتنا زیادہ طاری کرو کہ وہ ہر وقت تم کو یاد آتا رہے ۔ یہ ذکر در اصل گہرے تعلق باللہ کا نتیجہ ہے ۔ وہ مصنوعی طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ فطری طور پر اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ آدمی کا اندرون خدا کے خوف و محبت سے بھر گیا ہو ۔ بندہ نفسیاتی طور پر اپنے رب سے جڑ گیا ہو ۔ ذکرِ حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ تنہائیوں میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرے اور شدت یاد سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں (ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ) خدائے ذوالجلال کا ذکر آنسوؤں کے قطرات پر ہوتا ہے نہ کہ تسبیح کے دانوں پر ۔

قرآن کا ایک حکم جس میں روح کو تڑپانے اور قلب کو پگھلانے کا سامان تھا، اس کو ورزشِ لسان کے ہم معنی سمجھ لیا گیا

جو قلب کو صرف سخت کرنے والا ہے نہ کہ وہ لطافتِ احساس کے اس مقام کو پہنچائے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

دعا کے بجائے عملیات

دعا (اللہ سے مانگنا) اہم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) الدعاء ھی العبادۃ (دعا ہی عبادت ہے)۔ مگر یہود کے اثر سے مسلمانوں میں دعا کے بجائے عملیات کا رواج چل پڑا۔

دونوں کا فرق سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی ملازمت کے لئے یہ کرتا ہے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ یقین کرتا ہے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی ——— پہلی مثال درخواست کی مثال ہے۔ دوسری مثال کرتب یا عملیات کی مثال۔

خدا سے مانگنے کا طریقہ صرف دعا کا طریقہ ہے۔ دعا یا درخواست وہ چیز ہے جو بندے کو براہ راست خدا سے ملاتی ہے۔ وہ اس کے اندر عبودیت کے جذبات ابھارتی ہے۔ وہ اس کو دین کی حقیقت اعلیٰ سے آشنا کرتی ہے۔ دعا میں بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے۔ وہ اس کو پکارتا ہے۔ اس سے روتا گڑگڑاتا ہے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ان ربانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے جو کسی اور طرح آدمی کو نہیں مل سکتیں۔ اللہ سے مانگنے کی کیفیت ابھرنا سب سے بڑا دینی حاصل ہے۔ مگر عملیاتی کرتب دکھانا انتہائی بے معنی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

عملیات کی دو قسمیں ہیں ——— عبادتی عملیات اور ساحرانہ عملیات۔ عبادتی عملیات سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے متعلق یقین کر لیا گیا ہے کہ ان کو دہرا لینے سے آخرت کی نعمتوں کے دروازے آدمی کے اوپر کھل جاتے ہیں۔ ساحرانہ عملیات وہ ہیں جو دنیا کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔

راقم الحروف کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس میں محدثین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا تھا: "انھوں نے زبردست محنت کر کے تمام حدیثیں جمع کیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا"۔ موصوف نے انتہائی خفگی کے ساتھ اس فقرہ کا ذکر کیا۔ میں حیران تھا کہ اس فقرہ میں آخر وہ کون سی خرابی ہے جس پر وہ اتنے شدید ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر وہ بولے "آپ کیسے دعوی کر سکتے ہیں کہ محدثین نے تمام کی تمام حدیثیں جمع کر ڈالی ہیں"۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مثال کے طور پر صلاۃ معکوس کی روایت محدثین کو نہیں ملی۔ جب کہ فلاں بزرگ نے اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

صلاۃ معکوس کا مطلب ہے الٹی نماز۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بستی کے باہر کوئی ایسا اندھا کنواں تلاش کیا جائے جس کے اوپر درخت اگا ہوا ہو۔ آدمی درخت سے رسی لگا کر اپنا پاؤں اس میں باندھ لے اور کنوئیں میں سر نیچے پاؤں اوپر کر کے لٹک جائے اور اسی حالت میں نماز ادا کرے۔ بتایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک بار بھی یہ نماز پڑھ لے وہ دونوں

جہان کی سعادتیں سمیٹ لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ بزرگ موصوف نے اس روایت کے ساتھ اس کی سند نقل نہیں کی ہے۔ اس لئے کیوں کر اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس پر موصوف بگڑ گئے اور بات ختم ہو گئی۔

بعد کے دور میں، خصوصاً متصوفانہ حلقوں میں مسلمانوں کے درمیان بہت سے عملیاتی طریقے رائج ہوئے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ان پر اسرار شکلوں کو ان کے ظاہری آداب کے ساتھ دہرا دینے سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس قسم کے عملیات نے خدا کے دین کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں روایتی کہانی کا طلسماتی خزانہ تھا۔ وہ "سم سم" کہنے سے کھلتا تھا۔ دوسرا کوئی لفظ مثلاً جم جم یا دم دم کہنے سے نہیں کھلتا تھا۔ اسی طرح گویا اسلام کے بھی کچھ منتر یا کرتب تھے۔ آدمی نے اگر ان کو ظاہری صحت کے ساتھ دہرا دیا تو اس کے بعد نجات اور سعادت کے تمام دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے، ٹھیک ویسے ہی جیسے "سم سم" کہنے سے طلسماتی خزانہ کے دروازہ کا کھل جانا۔ مگر یہ وہ اسلام ہے جو دوسری قوموں کے اثر سے لیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی عبادت انابت الی اللہ (زمر ۱۷) کا نام ہے۔ اس کی حقیقت خدا کے آگے دل کا جھکاؤ ہے نہ کہ اعضاء و جوارح کے ذریعہ کوئی کرتب دکھانا۔

قرآن میں ساحرانہ عملیات کو کفر کہا گیا تھا (بقرہ ۱۰۲) مگر ایک خوبصورت تاویل کر کے اس کو اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی مذکورہ آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> "سحر میں اگر کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے۔ اور اگر کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو فسق اور معصیت ہے۔ اور اگر ضرر نہ پہنچایا جاوے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے" (تفسیر بیان القرآن)

اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جو فلاح آخرت کا راستہ دکھانے کے لئے آیا تھا، اس کو فلاح دنیا کا موضوع بنا لیا گیا۔ ہر قسم کے دنیوی مقاصد میں قرآن کو استعمال کیا جانے لگا۔ اسرائیلی روایات کے تحت عملیات کا جو علم سینہ بہ سینہ چلا آ رہا تھا، اس کے علاوہ خود "کتاب محفوظ" بھی طرح طرح کے عملیاتی نسخوں کا قیمتی ماخذ بن گئی۔

"اعمال قرآنی" کے نام پر مسلمانوں نے جو سفلی طریقے رائج کئے ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآنی سورتوں کے "خواص" کہا جاتا ہے۔ یہ خواص سب کے سب دنیوی نوعیت کے ہیں۔ حتیٰ کہ یہود کی تقلید میں ہر سورہ کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں اور ان کے نقوش بنا کر حاجات دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بے شمار لوگوں نے تعویذ گنڈوں کی دکانیں کھول لی ہیں اور قرآن کو ایک تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ سورہ مریم کے اعداد دو لاکھ ننانوے ہزار چھ سو چوالیس ہیں۔ اس کے اعداد کا نقش حسب ذیل ہے۔

۹۶۵۵۱	۹۶۹۴۴	۹۶۵۴۹
۹۶۵۴۹	۹۶۵۴۸	۹۶۵۵۳
۹۶۵۴۷	۹۶۵۵۲	۹۶۵۴۵

ایک بہت بڑے بزرگ لکھتے ہیں — "اگر باغ ویران شدہ میں درختوں کے ساتھ سورہ مریم کا یہ نقش باندھ دیں تو باغ گلہائے شگفتہ اور ثمر سے بھرپور ہو جائے"۔ ان اعمال کے نتیجہ میں نہ صرف قرآن ایک سستا دنیوی نسخہ بن کر رہ گیا بلکہ وہ قوم کے اندر توہمات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ کیوں کہ اس قسم کے نقش تعویذ سے کبھی کوئی ویران باغ پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا چمن نہیں بن سکتا۔ مزید یہ کہ جس قوم میں اس قسم کی عملیات کا رواج ہو جائے اس کے اندر کبھی صحیح معنوں میں خدا پرستانہ مزاج پیدا نہیں ہو سکتا۔ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اللہ سے مانگتا ہے اس کی توجہ تمام تر اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ عملیات کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کی توجہ اس عمل کے پُراسرار خواص پر لگی رہتی ہے۔ دعا میں آدمی اللہ سے جڑتا ہے اور عملیات میں خود عملیات سے یا ان پُراسرار اسباب سے جن کے متعلق اس کا گمان ہوتا ہے کہ وہ عملیات کے پیچھے کام کر رہے ہیں ——— صلاۃ التسبیح اور ختم خواجگان سے لے کر نقش تعویذ تک جو بے شمار عملیات مسلمانوں میں رائج ہوئے، انھوں نے دین خداوندی کو دین یہودیت بنا کر رکھ دیا ہے۔

ذاتی حکم کو خارج کی طرف موڑ دینا

قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے: وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باہمی تعلقات میں عدل پر قائم رہیں۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے نہ کسی کا حق دبائے۔ ترازو کی طرح ہر ایک سے انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ یہ آیت آدمی کو ابھارتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو عدل و انصاف کی راہ پر ڈال دے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں آیت کا یہ مطلب بیٹھ جائے کہ "لوگوں کے ترازو کو سیدھا کرو"، تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ اب اس آیت میں اس کی اپنی ذات کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی۔ وہ اس حکم کا مطلب یہ سمجھے گا کہ دوسروں کے اوپر "داروغۂ انصاف" بن کر کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنی اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے دوسروں سے لڑنا شروع کر دے گا۔ خواہ اس لڑائی کا نتیجہ عملاً شدید تر بے انصافی کو لانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔

یہی صورت ان لوگوں کے ساتھ پیش آئی ہے جو دین کو "اسٹیٹ" کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کی وجہ سے دین کو ایک ریاستی نظام کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ دین ان کے لئے حکومتی امور کا موضوع ہے نہ کہ حقیقۃً ذاتی اصلاح کا موضوع۔ اپنی دینی ذمہ داری کا تصور ان کے ذہن میں یہ ہے کہ دین کو ایک ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر جاری و نافذ کیا جائے۔ چوں کہ سارے قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے اس قسم کا دینی مشن اخذ ہوتا ہو۔ اس لئے ان کے ذہن نے نہایت آسان سبیل یہ نکالی کہ انفرادی احکام کو اجتماعیات کی طرف موڑ دیا۔ "ترازو صحیح تولو"، کو اس مفہوم میں لے لیا کہ "لوگوں کے ترازو صحیح کرو"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن احکام میں فرد کے لئے اپنی ذات کی غذا رکھی گئی تھی، وہ دوسروں کے خلاف تقریر اور ایجی ٹیشن کی خوراک لینے کا ماخذ بن کر رہ گئی۔

۱۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے ——— اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (شوری ۱۳) اس کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی کو پوری طرح دین کے سانچے میں ڈھال لو۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرو اور بندوں کے جو حقوق تمھارے اوپر آتے ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک پورا کرو۔ مگر جن لوگوں کے ذہن میں دین کا مذکورہ "انقلابی" مفہوم بیٹھا ہوا ہے، ان کے لئے یہ آیت اس قسم کی ذاتی غذا کا سبب نہ بن سکی۔ انھوں نے اپنے ذہنی شاکلہ کے مطابق اس کا مطلب یہ نکال لیا کہ ——— دین کو بحیثیت ایک ریاستی نظام کے زمین پر نافذ کرو۔ وہ آیت جو آدمی کے اپنے اندرون کو جھنجوڑنے والی تھی، وہ صرف خارجی ہنگامہ آرائی کا عنوان بن کر رہ گئی۔ اس آیت کو پڑھ کر مذکورہ ذہن نے فوراً اس قسم کی تقریر شروع کردی :

"قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا۔ اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کرکے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے۔ بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصہ پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جاسکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تقریر صرف اس لئے وجود میں آئی کہ وہ حکم جس کا مطلب تھا "دین پر قائم ہو" اس کو اس معنے میں لے لیا گیا کہ ——— "دین کو دوسروں کے اوپر قائم کرو۔"

۲۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (نساء ۱۳۵) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو! تم میں سے ہر شخص انصاف کو اختیار کرے، عدل کی روش پر خوب خوب قائم ہو جائے۔ اس حکم کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی اصلاح کے بارے میں پوری طرح متحرک کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذکورہ ذہن کے سامنے یہ آیت آئی تو اس نے اس کا ترجمہ کیا: "اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار بنو۔" اور اس کے بعد اس نے ان الفاظ میں اس کی تفسیر شروع کردی :

"یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل وراستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔"

اس تقریر کو پڑھنے والا اس آیت سے جو اثر لے گا وہ یہ کہ آدمی انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھے اور لوگوں کے اوپر انصاف کا نظام قائم کرے۔ بالفاظ دیگر یہ آیت، مذکورہ تشریح کے خانہ میں خارجی مشن کا پیغام بن جاتی ہے۔ حالاں کہ آیت کا اس قسم کے خارجی مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ : "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو"۔ یہ آیت ہر بندۂ مومن کو ذاتی طور پر خطاب کر رہی ہے اور اس کو خدا کا یہ پیغام پہنچا رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کے معاملات میں انصاف کی روش پر قائم رہنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو۔ اپنے آپ کو انتہائی

حدتک انصاف کا عامل بنا دے ـــــــ آیت کے اگلے الفاظ مزید تاکید کر رہے ہیں کہ جب کسی سے اختلاف ہو جائے اس وقت بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو۔ ایک حکم الٰہی جس میں ہدایت کی ذاتی غذا تھی، زاویہ نگاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ خارجی دنیا کے خلاف تقریری کمال دکھانے کا عنوان بن گیا

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ كَافَّةً (بقرہ ـ ۲۰۸) یہ آیت بھی اہل ایمان کو انفرادی طور پر خطاب کر رہی ہے اور ہر شخص سے کہہ رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ لو، اپنے عقائد اور اپنے اخلاق و معاملات میں اسلامی تعلیمات کو پوری طرح اختیار کر لو۔ اس میں ہر بندۂ مومن کے لئے ذاتی ہدایت کا سامان ہے۔ اس آیت میں ہر شخص اپنے رب کو اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے پاتا ہے۔ مگر مذکورہ دینی مزاج پیدا ہو جائے تو آیت کو پڑھتے ہی آپ کا ذہن خارجی دنیا کی طرف مڑ جائے گا۔ آپ اس کو تلاوت کر کے حسب ذیل تقریر شروع کر دیں گے :

"لوگو، قرآن کی یہ آیت ہمیں ایک عظیم انقلابی پروگرام دے رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اٹھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی حکومت کا نظام قائم کر دیں۔ خاندان سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس اور بین اقوامی زندگی تک کوئی گوشہ حکومت خداوندی سے باہر نہ رہے" بظاہر یہ تقریر بڑی شاندار معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک ایسے تقریری ریکارڈ کی مانند ہے جو خالی میدان میں بجایا جا رہا ہو، جس کا نہ کوئی سننے والا ہو اور نہ اثر لینے والا۔

۴ ـ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ـ ۶۷)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے : "حکم تو بس اللہ ہی کا ہے" ـــــ مطلب یہ کہ اس عالم میں طاقت و اقتدار کے تمام سرے خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کچھ بھی سوچے اور کتنی ہی تدبیریں کرے۔ مگر وہی ہو گا جس کی اجازت خدا دے گا۔ خدا کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آیت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر عاجز ہے۔ وہ یہ سبق دیتی ہے کہ انسان گھمنڈ کی روش ترک کر دے۔ وہ مکمل طور پر خدا پر بھروسہ کرے۔ اپنے معاملات میں اسی سے مدد کی درخواست کرے۔

مگر مذکورہ ذہن کے لئے آیت میں اس قسم کی ذاتی غذا نہیں ہو گی۔ آیت میں ایک ایسے اقتدار کا ذکر ہے جو بالفعل قائم ہے۔ مگر وہ اس سے ایک ایسا اقتدار نکال لے گا جو اسے اپنی انقلابی جدوجہد کے ذریعہ قائم کرنا ہے۔ وہ بس "حکم" کا لفظ لے گا اور پھر اپنی تقریر شروع کر دے گا:

"اقتدار صرف خدا کا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ زمین پر اپنا قانون جاری کرے۔ حکومتی اقتدار تمام تر خدا کا ہونا چاہیے۔ مومن کا مشن یہ ہے کہ غیر خدائی سیاست کی جتنی قسمیں زمین پر قائم ہیں ان کو ختم کر دے اور زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے" ـــــ آیت کا مدعا یہ تھا کہ خدا کی برتری یاد دلا کر انسان کو اس کا عبادت گزار بننے پر اکسایا جائے۔ مگر فوق الفطری حکم کو سیاسی حکم کے معنی میں لے کر اس سے سیاسی مشن نکال لیا گیا۔

۵ ـ اسی طرح مثال کے طور پر لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ کو لیجیے۔

الٰہ کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی طرف اپنی حاجتوں کے لئے رجوع کیا جائے ، اور عبادت کے معنی ہیں پرستش۔ یہ مفہوم انسان کے اندر عجز و افتقار کا مزاج پیدا کرتا ہے ۔ اس میں اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بنانے بگاڑنے کا سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے ۔ مجھے اپنی فلاح و نجات کے لئے اسی کی طرف دوڑنا چاہئے اور اسی کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہئے ۔ لیکن مذکورہ ذہن اس آیت میں الٰہ کے معنی حاکم لے لے گا اور عبادت کو سیاسی اطاعت کے ہم معنی سمجھنے لگے گا ۔ اس آیت کو پڑھ کر اس کے اندر جو جذبہ ابھرے گا وہ یہ کہ خدا ہی سیاسی حکمراں ہے اور اسی کی سیاسی اطاعت زمین پر قائم ہونی چاہئے ۔ " بظاہر یہ ایک اچھی اور صحیح بات معلوم ہوتی ہے ۔ مگر اس تشریح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت سے عبودیت کی جو غذا ملنی چاہئے ، وہ آدمی کو نہیں ملے گی ۔ اس کو پڑھ کر اس کے اندر سیاست آرائی کا ذہن ابھرے گا ۔ وہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کو کام سمجھے گا ۔ اس آیت سے اس کو سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی غذا ملے گی نہ کہ اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کی ۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کے مذکورہ تصور کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے ذہن میں حکم الٰہی کا نشانہ بدل جائے گا ۔ اب اپنی ذات کے بجائے خارج کی دنیا وہ جگہ ہوگی جہاں وہ حکم الٰہی کی تعمیل کرنا چاہے گا ۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے بجائے " نظام " کو بدلنے پر اپنی ساری نظریں جما دے گا ۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے ۔ مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی ۔ نماز کی " اقامت " سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ ہوگی مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے ۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوّام کی حیثیت رکھتے ہیں ، اس میں اہل باطل کی روش کی تقلید ہو رہی ہوگی ۔ مگر ملک کے اندر وہ قوام بننے کا نعرہ لگائیں گے تاکہ ملک سے باطل نظام کو ہٹایا جا سکے ۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا مگر وہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ دنیا بھر میں خداپرستی کا چرچا کیا جا سکے ۔ " جزء دین " پر عمل کرنے میں وہ کوتاہ ہوں گے مگر " کل دین " کے نفاذ کے لئے وہ بین اقوامی کانفرنس کا انعقاد کریں گے ۔ خواہ اس کا انعقاد عملاً وقت اور مال کے ضیاع کے ہم معنی کیوں نہ ہو ۔

دینی اتحاد کے بجائے دینی اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ سابق اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے ، تم لوگ ۷۳ فرقوں میں بٹ جاؤ گے ۔ یہ تنبیہ آج واقعہ بن چکی ہے ۔ مسلمانوں میں مختلف ناموں سے بے شمار فرقے اور جماعتیں وجود میں آگئی ہیں ۔ ہر ایک نے اپنا علیحدہ تنظیمی ڈھانچہ بنا رکھا ہے ۔ ہر ایک کا اپنا لٹریچر ہے ۔ حتیٰ کہ اپنی اپنی شرحیں اور تفسیریں تیار کر کے ہر ایک نے اپنا قرآن و حدیث بھی الگ کر لیا ہے ۔ یہ صورت حکم الٰہی کے سراسر خلاف ہے ۔ اللہ نے دینی اتحاد کی تاکید فرمائی تھی (آل عمران ۱۰۳) ہم نے اس کو دینی اختلاف میں تبدیل کر لیا ۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی رحمتیں اور نصرتیں ہمارے اوپر نازل ہوں ۔

دینی اختلاف پیدا ہونے کی وجہ ہمیشہ ایک ہی رہی ہے ۔ دین کے کسی اضافی جزء کو اعتقاداً یا عملاً وہ اہمیت دینا جو دین کے حقیقی اور اساسی جزء کو ہونی چاہئے ۔ دین کے حقیقی حصہ کو قرآن میں الدین (شوریٰ ۱۳) اور اس کے اضافی اجزاء کو شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کہا گیا ہے ۔ الدین سے مراد وہ ابدی تعلیمات ہیں جو تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دی جاتی رہیں ۔ مثلاً توحید، اخلاص وغیرہ ۔ شرعۃ سے مراد قانونی تفصیلات اور منہاج سے مراد پیغمبر کی سنت یا تعامل ہے[ہ] ۔ یہ تفصیلات اور تعامل وقتی حالات کے تابع ہوتے ہیں ، اس لئے ان میں مختلف انبیاء کے یہاں فرق پایا جاتا ہے ۔ قرآن میں حکم دیا گیا کہ صرف پہلی چیز کو مدار دین قرار دو ۔ دوسرے امور میں توسع کا طریقہ اختیار کرو ۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے :

یاایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم ۔ وان هٰذہ امتکم واحدۃ وانا ربکم فاتقون

اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو ۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو ۔ اور یہ تمھارے دین کے لوگ سب ایک دین پر ہیں ۔ اور میں تمھارا رب ہوں ۔ سو مجھ سے ڈرو ۔

(مومنون ۵۳)

اس آیت کے مطابق وہ واحد دین جو تمام پیغمبروں کے درمیان متفق علیہ ہے ، یہ تھا ——— خوراک میں حلال و حرام کا لحاظ رکھنا ، نیک عمل کرنا ، اللہ کو علیم و خبیر جانتے ہوئے زندگی گزارنا ، اللہ کو اپنا رب اور آقا بنانا ، صرف اللہ سے ڈرنا ۔ بعض دوسری آیتوں میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہے ۔ مثلاً حنیفیت ، انابت الی اللہ ، نماز ، روزہ ، شرک سے پرہیز (روم ۔ ۳۱) اوپر کی آیت میں "عمل صالح" ان سب چیزوں کے لئے جامع لفظ ہے ۔ عمل صالح میں مذکورہ متعین اعمال کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو قرآن کی دوسری آیات سے بالفاظ صریح ثابت ہوتی ہیں ۔ مثلاً روزہ ، عدل ، ترک ظلم وغیرہ ۔

یہی ثابت شدہ اور متفق علیہ دین "دین قیم" ہے ۔ اور دین میں اصل اہمیت انھیں چیزوں کی ہے ۔ انھیں کو مدارِ دعوت بنانا ہے اور انھیں کی بنیاد پر امر و نہی کی مہم چلانا ہے (آل عمران ۱۰۴) ان کے سوا جو چیزیں شریعت اور منہاج سے تعلق رکھتی ہیں ، ان میں اپنے حالات کے لحاظ سے اگرچہ لازماً کوئی نہ کوئی ضابطہ اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا ۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کی حیثیت ہمیشہ اضافی ہوگی ۔ اگر ان کے معاملہ میں وہ شدت اختیار کی جائے جو حقیقی امور کی ہے تو یہ سبل متفرقہ کا اتباع (انعام ۱۵۳) ہے جو صرف اختلاف امت پر منتج ہوتا ہے ۔ کیوں کہ الدین ایک ہے ۔ جب کہ شریعت اور منہاج میں فرق ہے اور لازماً فرق رہے گا ۔ اس فرق کی وجہ سے ان کے معاملہ میں کلی اتحاد ممکن نہیں ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر آپ ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کی نوعیت شریعت اور منہاج کی ہے تو اس کو یہ عنوان مت

ہ (شرعۃ ومنهاجا) عن ابن عباس سبیلاً وسنۃً وکذا روی عن مجاهد وعکرمۃ وحسن البصری وقتادہ والضحاک والسدی ، ابن کثیر

دیجیے کہ ———— "یہی تمام انبیاء کا مشن تھا"۔ شریعت اور منہاج میں مختلف طریقوں کا امکان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کسی کے لئے ایک طریقہ قابل ترجیح ہوگا کسی کے لئے دوسرا۔ اب اگر اسی کو انبیاء کا اصل مشن بتایا جائے تو مختلف لوگ مختلف چیزوں کو انبیاء کا مشن سمجھنے لگیں گے اور نتیجۃً ایک دین میں کئی دین بن جائیں گے۔ اور وہ تفریق فی الدین وجود میں آئے گی جو اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے شرعۃ اور منہاج کی ایک ایک مثال لیجئے۔

سیکڑوں برس سے مسلمانوں میں بار بار ایسے لوگ اٹھتے رہے ہیں جن کا کہنا تھا کہ لوگو "نماز ادا کرو"۔ مگر ان کوششوں نے امت کے اندر کبھی کوئی نمازی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ آج کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ نہیں ہے جو اس لئے علیحدہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ لوگوں کو نماز کی تاکید کرتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ اٹھے جنھوں نے اس قسم کے مسائل چھیڑے کہ نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں۔ آمین دھیرے سے کہنا افضل ہے یا زور سے کہنا، رفع یدین کے ساتھ نماز درست ہے یا اس کے بغیر۔ اس قسم کی بحثوں نے ملت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔ الگ الگ مدرسے، الگ الگ مسجدیں، الگ الگ جماعتی حلقے وجود میں آ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسئلہ شرعۃ کی نوعیت کا تھا، اس کو انھوں نے الدین کی حیثیت دے دی۔ دین کا وہ حصہ جس میں ایک سے زیادہ طریقوں کی گنجائش تھی، اس کو دین کے اُس حصہ کی مانند بنانا چاہا جس میں کوئی ایک ہی طریقہ درست ہوتا ہے۔

اب منہاج کی ایک مثال لیجئے۔

مسلمان قرن اول سے لے کر اب تک ہر دور میں حکمرانوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان سیاسی مقابلوں کی وجہ سے امت میں کوئی علیحدہ فرقہ بن گیا ہو جو اس حیثیت سے جانا جاتا ہو کہ یہ "مسلم سیاسی فرقہ" ہے۔ ساری تاریخ میں صرف دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ایک شیعہ۔ دوسرے وہ لوگ جو موجودہ زمانہ میں اپنے کو حکومت الٰہیہ کا علم بردار کہتے ہیں۔ شیعہ گروہ پہلی صدی ہجری میں اسلامی سیاست کا جھنڈا لے کر اٹھا۔ مگر اس کی سیاست، دوسرے سیاسی لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ دوسرے لوگوں نے سیاست کو صرف سیاست (بالفاظ دیگر عملی ضرورت) کے طور پر اختیار کیا تھا۔ جب کہ شیعہ حضرات نے سیاست کو مستقل عقیدہ قرار دیا۔ سیاست اپنی نوعیت کے اعتبار سے، منہاج کے ذیل کی چیز تھی جس کی صورت وقتی حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ مگر شیعہ گروہ نے سیاست کو الدین کی طرح دائمی حکم ثابت کرنا چاہا۔ خاص طرح کے مزاج کے سوا عام لوگ ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے اندر ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ حکومت الٰہیہ کے علم بردار ہیں، وہ ایک اور انداز سے اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان کی دائمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کا سیاسی نظام قائم کرنے کے لئے "اپنی جان لڑائے"، کیونکہ یہی اصل دینی مشن ہے اور اسی کے لئے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے تھے۔ اسلامی حکومت بجائے خود یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر وہ منہاج کے ذیل کی چیز ہے نہ کہ الدین کے ذیل کی۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی جزء۔ یہ کوئی علی الاطلاق مشن نہیں ہے بلکہ وقتی حالات یہ طے کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اہل ایمان کی کیا ذمہ داری ہے۔ چنانچہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں بالفاظ صریح اس طرح کا حکم دیا گیا ہو یا اس کو انبیاء کا مشن بتایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں خاص طرح

کی ذہنی افتاد کے لوگ ہی اس اپج کا ساتھ دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس عقیدہ کے گرد جمع ہوئے وہ عام امت سے الگ ایک قسم کا سیاسی فرقہ بن کر رہ گئے۔

اوپر کی آیات میں جن چیزوں کو "الدین" قرار دیا گیا ہے، اگر ان کی اقامت و پیروی کے لئے جدوجہد کی جائے تو امت میں کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہ تمام کی تمام متفق علیہ چیزیں ہیں۔ ان کی تحریک سے اتحاد کی فضا ابھرے گی۔ اس کے برعکس شرعۃ اور منہاج کی نوعیت کی چیزوں کو لے کر اٹھنا اور کہنا کہ یہی الدین ہے، صرف تفرق فی الدین کا سبب بنے گا۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسی قسم کی چیزوں کو دعوت و تحریک کی بنیاد بنا کر اپنا وہ حال کر لیا ہے جس کی تصویر اس آیت میں دی گئی ہے:

اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم۔۳۲)	جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہو گئے فرقے فرقے۔

یہ فرقہ بندی کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ دین کی اصل روح کو ختم کر دینے والی ہے۔ دینی اتحاد کی فضا ہو تو آدمی خدا سے جڑتا ہے۔ لوگوں کی توجہ دین کے حقیقی تقاضوں پر لگی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دینی اختلاف کی فضا ہو تو اصل دینی تقاضے دب جاتے ہیں۔ لوگ اہم کو چھوڑ کر غیر اہم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے حلقے سے وابستگی کا نام لوگوں کے نزدیک دین بن جاتا ہے۔ ان کو اس اعلیٰ ایمانی سطح کا تجربہ ہی نہیں ہوتا جب کہ آدمی ہر چیز سے اوپر اٹھ کر "خدا کے حضور میں چلنے لگتا ہے"۔

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے

سابق اہل کتاب (بنی اسرائیل) کو خدا کی طرف سے جو مشن سپرد ہوا، وہ تبیین کتاب (آل عمران ۱۸۷) تھا یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ بعد کے دور میں جب ان پر زوال آیا تو وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل پڑے۔ تاہم اپنے نعروں اور تقریروں میں اب بھی وہ تورات ہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اقامتِ تورات کے لئے کر رہے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ کے یہودیوں کی صہیونی تحریک تمام تر ایک قومی تحریک ہے۔ مگر اس کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں تورات کے حوالے دیتے ہیں۔ ایک ایسا کام جس کا خدائی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں، اس کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا یہ سب کچھ خدائی احکام کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔

یہود کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (آل عمران ــ ۱۸۸)	وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا، اس پر ان کی تعریف ہو۔ ان کو عذاب سے بچا ہوا نہ سمجھو۔ اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

یہی معاملہ ہر اس قوم کا ہوتا ہے جس کو خدا کی کتاب کا حامل بنایا گیا ہو۔ بعد کے دور میں جب اس قوم پر زوال

آتا ہے اور وہ کتاب اللہ کو ایک چھوڑی ہوئی کتاب (فرقان ۳۰) بنا دیتی ہے تو یہ چھوڑنا صرف عملاً ہوتا ہے نہ کہ لفظاً۔ اس کی زندگی اور اس کی سیاست حقیقۃً دوسری راہوں پر چل رہی ہوتی ہے مگر اس کے رہنما اپنی غیر خدا پرستانہ تحریکوں کو ہمیشہ خدا پرستانہ اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک غیر دینی کام پر دین کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں" وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے کام کے لئے ان کی تعریف کی جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے دینی الفاظ اور تصورات اس قوم کی روایات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ قومی قیادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قوم کی مانوس دینی اصطلاحات میں کلام کرے۔ اس کے بغیر نہ رہنماؤں کا اعتماد قوم کے اندر قائم ہو سکتا اور نہ عوام کا پر جوش تعاون ان کو مل سکتا ——— یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت کا ہوا ہے۔ انھوں نے قومی جذبات کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو اسلام کا تقاضا بلکہ انبیاء کا اصل مشن بتاتے رہے۔ انھوں نے ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہا جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا تھا۔

مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریکیں چلائیں اور ان کو "جہاد" کا عنوان دیا۔ حالاں کہ جہاد خدا کے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے جدوجہد کا نام ہے نہ کہ کسی ایسی سیاست کا جس کا مقصد یہ ہو کہ اجنبی حکمرانوں کو ہٹا کر ملکی لوگوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔ انھوں نے سیکولر مقاصد کے تحت متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے "صحیفہ مدینہ" کا حوالہ دیا۔ حالاں کہ یہ صحیفہ مدینہ کے اوپر اسلام کے غلبہ کا اعلان تھا نہ کہ کسی مشترکہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی شمولیت کا۔ یہ صحیفہ کوئی دو طرفہ معاہدہ نہ تھا۔ وہ "خدا کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ایک نوشتہ تھا مہاجرین قریش اور اہل یثرب کے لئے"۔ اس میں درج تھا: وانکم مهما اختلفتم فيه من شيءٍ فان مردّه الى الله والى رسوله (اہل مدینہ کے درمیان جب کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور اس کے رسول سے رجوع کیا جائے گا)۔ کسی اکثریت کا سیکولر ضمیمہ بننے کی کوشش سے اس صحیفہ کا کیا تعلق۔ انھوں نے معاشی اور سماجی حقوق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبات کی تحریک چلائی اور اپنے منشور میں یہ لکھا کہ ہم خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ حالاں کہ جن اقوام کے خلاف وہ حقوق طلبی کی مہم لے کر اٹھے تھے، وہ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں اور مدعو قوم سے "اجر" کا مطالبہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ انھوں نے انسانی بھائی چارہ اور دنیوی امن کے لئے تقریری مہم چلائی اور کہا کہ یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا کیونکہ دور جاہلیت کے حلف الفضول[1] میں آپ شریک ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مظلوموں کی مدد اور حق داروں کو ان کا حق دلانے کے اس معاہدہ میں آپ نے اپنی پندرہ سال کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد آپ نے فرمایا: لو دعيتُ به فى الاسلام لاجبت (زمانہ اسلام میں بھی اگر مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا) مگر

---

[1] اس معاہدہ کا نام حلف الفضول اس لئے پڑا کہ اس میں یہ جملہ تھا: تُردُّ الفضول الى اهلها (سہیلی، روض الانف) یعنی مال ان کے مالکوں کو لوٹایا جائے گا۔

اولاً تو حلف الفضول تقریری دوروں کی کوئی مہم نہ تھی۔ وہ عملی دادرسی کا عہد نامہ تھا۔ دوسرے نبوت ملنے کے بعد آپ نے خود حلف الفضول کی تجدید نہیں کی بلکہ اس میں شرکت کو دوسروں کی پکار پر مشروط رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حلف الفضول بجائے خود ایک جائز اور مطلوب کام ہونے کے باوجود بہر حال فلاح دنیا کے ذیل کا ایک پروگرام تھا۔ جب کہ نبوت کا اصل مشن فلاح آخرت کا پیغام ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ قائدین نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چھیڑ دی اور اعلان کیا کہ شریعت اسلامی کے نفاذ اور قیادت صالحہ کے قیام کے لئے ہم ایسا کر رہے ہیں۔ حالاں کہ صریح ہدایات کے مطابق اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کی جائے۔

اس قسم کی تمام "اسلامی" مہمیں جن میں مسلمان موجودہ زمانہ میں مشغول رہے ہیں وہ سب کی سب يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا کا مصداق ہیں۔ یہ ایک غیر اسلامی کام کے لئے اسلام کا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش ہمیشہ خدا کی نصرت سے محروم رہتی ہے، اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے، وہ بہر حال بے نتیجہ رہے گی۔ وہ امت کے لئے کسی حقیقی کامیابی کا باعث نہیں بن سکتی۔ بائبل کی روایات کے مطابق دارا بادشاہ (پانچویں صدی قبل مسیح) کے زمانہ میں ایک حجّی نبی گزرے ہیں۔ انھوں نے یہود کی بگڑی ہوئی حالت پر ان کو تنبیہ کی۔ انھوں نے تمثیلی زبان میں کہا:

> "رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔ کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہ آسمان سے اوس گرتی ہے اور نہ زمین اپنا حاصل دیتی ہے۔ (باب اول)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا انجام ہوا ہے۔ انھوں نے "بہت بویا پر تھوڑا کاٹا"۔ عالی شان تحریکوں اور دھواں دھار کانفرنسوں کا حاصل عملاً اتنا کم ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارا ہر قائد اپنی "محنت کی کمائی" کو سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳–۱۷۶۲) نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ مرہٹوں پر حملہ کرایا۔ سید احمد بریلوی (۱۷۸۶–۱۸۳۱) نے سکھوں سے جہاد کیا۔ مگر عملاً اس کا فائدہ صرف انگریز کو پہنچا۔ سید قطب مصری (۱۹۰۶–۱۹۶۶) اور ان کے ساتھیوں نے شاہ فاروق کے خلاف قربانیاں دیں۔ مگر اس کا فائدہ تمام تر فوجی افسروں کے حصہ میں چلا گیا۔ پاکستان میں اسلام پسندوں نے جمہوریت کے ذریعہ اسلام کا اقتدار لانے کے لئے ۳۰ سال تک سرفروشی کی۔ مگر اس کا فائدہ مسٹر بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسے لوگوں کو ملا۔ ۱۹۴۴ میں جامعہ ازہر سے ایک جلوس نکلا جس کی قیادت شیخ حسن البنا (۱۹۰۶–۱۹۴۸) کر رہے تھے۔ ہزاروں پُر جوش مسلمانوں نے قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) کے نعروں کے ساتھ اسرائیل کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پچھلے ۳۵ سال میں اس مہم میں جان و مال کی اتنی زیادہ

قربانیاں دی گئی ہیں جو تین سو سالہ صلیبی جنگوں کی مجموعی قربانی سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر فلسطین کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ جہاں وہ ۱۹۴۸ میں تھا، آج اس سے کہیں زیادہ دور جا چکا ہے۔

اس مدت میں ہمارے درمیان ایسے قائدین اٹھے جن کو بادشاہوں تک کا تعاون حاصل تھا (شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی) ہم نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جنھوں نے عظیم ترین آبادی والے ملک کے تقریباً تمام مسلمانوں کی تائید حاصل کر لی (مسلم لیگ) حتیٰ کہ ہمارے درمیان ایسی بھی تحریکیں اٹھیں جن کو تمام عالم اسلام کی مشترکہ حمایت حاصل تھی (فلسطینی تحریک) اس کے باوجود صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ آج بھی یہ حال ہے کہ کسی جماعت کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اس کے دینی اجتماعات میں دس دس لاکھ مسلمان شریک ہوتے ہیں (ہندستان) کسی اسلامی تحریک کے قائدین اپنی مقبولیت کو بتانے کے لئے یہ پُرفخر الفاظ بول رہے ہیں کہ ملک کا ہر فرد ان کے اسلامی نظام کے پروگرام سے اتفاق کرتا ہے (پاکستان) یہ سب کچھ ہے مگر وہی چیز حاصل نہیں ہوتی جو تمام قائدین اور جماعتوں کا مشترک مقصد ہے یعنی اسلام کا غلبہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے نمائندہ کی ہے۔ وہ آسمانی کتاب کے حامل ہیں۔ ایسے کسی گروہ کی قسمت تمام تر اس کتاب کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کی کتاب کا اعلان و اظہار کر رہے ہوں۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں اسی طرح بے قیمت ہو جائیں گے جس طرح پچھلے حاملین کتاب بے قیمت ہو گئے۔ کوئی دوسرا کام خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، خدا کی نظر میں ہم کو قیمت والا نہیں بنا سکتا۔

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا۔ چینی فوجیں آسام کے علاقہ میں گھس آئیں۔ اس وقت تیزپور (آسام) میں جو ہندستانی کمشنر تھا وہ اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنے وطن میں آکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے کمشنر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس پر سرکاری ڈیوٹی چھوڑنے کا مقدمہ چلایا گیا اور اس کو سخت سزا دی گئی۔ بچوں میں رہنا یا اپنے گھر کا انتظام سنبھالنا عام آدمیوں کے لئے کوئی غلط بات نہیں۔ مگر کمشنر کے لئے یہی بات ناقابل معافی جرم بن گئی۔ کیوں کہ کمشنر کی قیمت "تیزپور" میں تھی۔ گھر کے اندر نہ تھی۔ اگر وہ اپنے ڈیوٹی کے مقام پر جما رہتا تو اس وقت وہ حکومت کا نشان ہوتا۔ بلکہ وہ حکومت کے لئے عزت کا سوال بن جاتا۔ حکومت اس کو بچانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیتی۔ مگر جب اس نے اپنی وہ جگہ چھوڑ دی جہاں اس کو رکھا گیا تھا تو حکومت کی نظر میں اس نے اپنی قیمت کھو دی۔ اب وہ ہر حال میں مجرم تھا۔ خواہ کسی اور میدان میں وہ کتنی ہی سرگرمیاں دکھا رہا ہو، خواہ وہ بظاہر صحیح اور مفید ہی کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

ہماری نجات اور کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی کتاب کی طرف لوٹیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح سنت الٰہی کی زد میں آجائیں جس طرح اس سے پہلے یہود آ گئے۔ اور اس کے بعد نہ دنیا میں ہماری کوئی قیمت ہو اور نہ آخرت میں۔ دوسرے دوسرے کاموں کو دعوتِ قرآن اور احیاء سنت کا نام دینا صرف ہمارے وزر (بوجھ) میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔

اُردو

	Rs.
تذکیرالقرآن جلد اول	200/-
تذکیرالقرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوتِ حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	--
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
فکرِ اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے جہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اَور	3/-

آڈیو کیسٹ

	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریقِ کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	8/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam And Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-